

تین واضح پہلو دیے ہیں :

- (۱) پہلا پہلو اس صدی کے آغاز غالباً ۱۹۱۰ء میں انگلستان کے مشہور آفاق فلسفی بریڈلے (F.H. BRADLEY) نے دنیا کے تمام حامیان مذہب کو دیا تھا۔
 تم تو بریڈلے سے ضرور واقف ہو گے لیکن عام قارئین کی اطلاع کے لیے اس قدر صراحت ضروری ہے کہ میری رائے میں پہلی کے بعد دنیا میں تصویریت مطلقہ (ABSOLUTE IDEALISM) کا اُس سے بڑا علمبردار اور کوئی نہیں گزرا اور اس کا شاہکار ”منظاہر اور حقیقت“ (APPEARANCE & REALITY) کانٹ کے شاہکار ”تنقید عقل خالص“ (CRITIQUE OF PURE REASON) کے بعد،
 دوسرا یہ تھا کہ سب سے بڑی تصنیف ہے۔ اور یہ رائے صرف میری نہیں ہے، بلکہ انگلستان کے مشہور فلسفی EDWARD CAIRD اور مشہور عالم الہیات ریشڈل (RASHDALL) کی رائے بھی یہی ہے۔ نیز ہندوستان کے مشہور فلسفی پی۔ٹی۔ راجو (P.T. RAJU) کی رائے میں تو بریڈلے کا شمار دنیا کے عظیم حکماء میں سے ہے۔

بریڈلے نے تو اپنی تصنیف مذکورہ کے پہلے حصہ میں مسلک مادیت کی تردید میں ایسی براین قاطع اور ادلہ ساطع جمع کر دی ہیں جن کا جواب آج تک کسی مادہ پرست سے ممکن نہیں ہو سکا، اور نہ آئندہ ہو سکے گا۔ تہہ ماد میں یونان میں زینو () اور ہندوستان میں مانگا رجن (بودھ دھرم) کے فلسفیانہ مدرسے فکر الہستی بہ ثنویں اور کا عظیم ترین علمبردار منطقی مونٹگافیوں میں بریڈلے کے ہم پلہ ہیں۔ بریڈلے کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ عصر حاضر کا نامور فلسفی بریڈلے ریشڈل کا سخت مخالف ہے، بریڈلے کی عظمت و رفعت فکر کا ساری عمر معترف رہا۔ دیکھو،

'SCEPTICAL ESSAYS' P. 39

آدم بریڈلے، بریڈلے نے اپنے مجموعہ مفتالات موسومہ بہ —

'ESSAYS ON TRUTH & REALITY' کے ایک مقالے کے

آخر میں (جس کا نام "ON GOD AND THE ABSOLUTE" ہے

یہ قابلِ غور پیرا گراف دکھائے :

”میرے خیال میں دنیا کو اس وقت ایک نئے مذہب کی ضرورت ہے جس کے لیے کچھ تقاضے بھی ہونے لگے ہیں۔ ہمیں ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے، جو تمام انسانی اغراض اور مطالبات کو ایک خاص تناسب کے ساتھ ملحوظ رکھے اور ان کے جواز کا اعتراف کرے اور عقلِ انسانی کے لیے ایک ایسی بنیاد فراہم کرے جس پر پورے اعتماد سے بھروسہ کیا جاسکے۔ کیا ہم یہ نیا مذہب حاصل کر لیں گے؟ کیا یہ نیا مذہب موجودہ مذاہب میں ترمیم و تفسیح کے ذریعے بنایا جاسکتا ہے؟ اور اگر نہیں ہے، میں اس کا کافی الحاح کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن جہاں تک میری بصیرت کام کرتی ہے، دنیا کے اس عام تقاضے کو پورا کرنا فلسفے کے بس کی بات نہیں ہے۔ مجھے اس امر میں بھی شک ہے

کہ کسی مذہب کے اصول بالآخر ہماری ”ULTIMATE CONSISTENCY“ کی مابعد الطبیعیاتی ضرورت کو پورا کر سکیں گے۔ میری رائے میں جس چیز کی ہم معقول طور پر خواہش کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو ایک عقیدہ ہو اور دوسری طرف ایک تحقیقی فلسفہ، جو اس عقیدے کے لیے جواز اور استدلال مہیا کرے۔ میرا خیال ہے کہ کسی مثبت مابعد الطبیعیاتی نظریے کی بنیاد باطنی تجربے پر ہونی چاہیے، جبکہ مذہب کی بنیاد اگر باطنی تجربے پر ہو تو وہ زندگی سے مندرار اور محرومی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے ایک مذہبی عقیدہ جس کی بنیاد مابعد الطبیعیات کے سوا کسی اور چیز پر ہو یا ایسا مابعد الطبیعیاتی فلسفہ جو کسی مذہبی عقیدے کی تائید کر سکے، ہماری خواہشات کو پورا کر سکتا ہے۔ لیکن ہے میں خود اس خواہش کو پورا ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکوں اور اگرچہ اس راستے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں لیکن پھر بھی میں اس کی تکمیل کو ممکن نہیں سمجھتا۔“

(اس کا اصل انگریزی پیرا گراف ٹائٹل کے اندر کے صفحہ پر دیکھیں)

تمہاری آگاہی اور معلومات میں اضافے کی خاطر یہ بات ذیل میں درج کرتی جا رہی ہیں کہ اس پیرا گراف کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ پروفیسر

جیمس وارڈ نے اپنے آخری مقالے میں، جو انہوں نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے لکھا تھا،
مترجمہ بالا پیرا گراف کو من و عن نقل کیا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے ”ایمان اور
حیات ابدی“

خلطِ سمجھ کے خوف سے میں اس مقالے کا تعارف پیش نہیں کروں گا لیکن
وارڈ سے متعلق چند تعارفی الفاظ ضرور لکھنا چاہتا ہوں۔

یہ مذہبی فلسفی جو دراصل ایک عالم الہیات تھا، بریڈلے کا ہم عصر تھا۔ اُس نے
بریڈلے سے ایک سال کے بعد ۱۹۲۵ء میں وفات پائی، اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہوئی

1. NATURALISM AND AGNOSTICISM, 1899

2. THE REALM OF ENDS: PLURALISM & THEISM, 1911

بریڈلے تصوراتِ مطلقہ کا علمبردار تھا اور جیمس وارڈ تصوراتِ کما مخالف اور حائی
مذہبِ عیسوی عالم تھا۔ لیکن اس نے بریڈلے کے اس چیلنج کو اس قدر وقیع اور لائق
توجہ سمجھا کہ اپنے مقالے میں اس کو لفظ بہ لفظ نقل کیا اور اس سے ایمان کی اہمیت
پر استہزا کرنے کے بعد یہ متناظر کی کہ ”میں تو اب لبِ گور ہوں، کاشش کیمبرج کا
کوئی عالم الہیات، آکسفورڈ کے اس شہرہ آفاق فلسفی کے چیلنج کا جواب با صواب
لکھے۔“

وارڈ نے یہ مضمون ۱۹۲۵ء میں لکھا تھا مگر ابھی تک کسی نصرانی عالم نے اس
چیلنج کو قبول نہیں کیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی تثلیث، تجسم اور کفارہ کا معتقد
بریڈلے کے چیلنج کا جواب دے ہی نہیں سکتا۔

(۲)

۱۹۳۸ء میں لارڈ ٹنٹین نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جو خطبہ تقسیمِ اسناد
دیا، اس میں اس نے بایں الفاظ مسلمانوں (CONVOCAATION ADDRESS)

کو چیلنج دیا :-

”میرے عزیز مسلمان لو جو انو!

اس وقت یورپ روحانی اعتبار سے مُردہ ہے۔ اور احسن لائق لحاظ سے

لے مُردہ لادینی افکار سے افترنگ میں عشق عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام (اقبال)

مریض ہے اور معاشی زاویہ نگاہ سے سخت مضطرب ہے اور تاریکی میں ٹامک دیاں مار رہا ہے۔

وہ اپنی اجتماعی زندگی کے کسی مسئلے کو تسلی بخش طریقے سے حل نہیں کر سکتا۔ وہ اس وقت ایسے نظام حیات کی تلاش میں ہے جو اس کے روحانی، اخلاقی، سیاسی، معاشی اور عمرانی مسائل کا تسلی بخش حل پیش کر سکے۔

اے نوجوانو! تمہارا دعویٰ ہے کہ اسلام بنی آدم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور اس میں عقل، دل اور نگاہ تینوں کی تسفی بلکہ آ باری کا سامان موجود ہے۔

ہو! میں تمہیں محض یہ منظرہ دیتا ہوں کہ تم تازہ گریجو یٹوں میں سے جو لوگ اپنے دین کی صداقت پر سچستہ یقین رکھتے ہیں، وہ اپنے دین کی تبلیغ کے لیے یورپ کے مختلف ملکوں میں مبلغ اسلام کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں اور اپنی زندگی اس مقدس کام کے لیے وقف کر دیں۔

میرے بیٹے میں نے یہ چیلنج ۱۹۳۸ء میں پڑھا تھا۔ وہ رسالہ نرضائع ہو گیا مگر چیلنج کا مفہوم اسی وقت میرے دل پر نقش ہو گیا تھا۔ لارڈ موصوف کا یہ خطبہ ہندستان کے کئی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوا تھا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول نہیں کیا۔

(۳)

”میسرا چیلنج پر پروفیسر ولیم مننگری واٹ نے ۱۹۵۶ء میں دیا۔ یہ فاضل شخص ایڈنبرا یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر ہے۔ اور اس نے بڑی جانفشانی اور تحقیق کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، شخصیت، کاروائی نمایاں اور آپ کے پیدا کردہ انقلاب پر دو کتابیں لکھیں۔

1. 'MOHAMMAD AT MECCA'
2. 'MOHAMMAD AT MADINA'

۱۔ یورپ از مشرق خود بسملفت دبا ۲۔ بزرگروں رسم لادینی نہاد ۱۰ اقبال
۳۔ اک اضطراب ہے دنیا کو نا صوری سے ۴۔ سبب یہ ہے کہ وہ محروم ہے صفوں اکبر
۵۔ تدرج خود فروزے کہ فرنگ داد مارا ۶۔ ہمہ آفتاب لیکن اثر محمد ندارد (اقبال)

یہ دونوں کتابیں ایک خاص پہلو پر لکھی ہیں اور جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے، انگریزی یا کسی اور زبان مثلاً اردو، فارسی اور عربی میں کسی شخص نے یہ انداز سیرت نگاری اختیار نہیں کیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ دونوں کتابوں کے چھ سو صفحات پڑھ لینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ عظمت کا کوئی نقش قاری کے ذہن پر قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے مستشرقین کی تصانیف کا طرز امتیاز۔ بہر حال اپنی دوسری تصنیف میں ص ۳۳۳ پر واٹ نے حسب ذیل الفاظ میں ساری دنیا کے اسلام کو چیلنج دیا ہے :

”اب مسلمان اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد تمام بنی نوع کے لیے رسول اور خالق کا ایک مثالی نمونہ ہیں۔ یہ دعویٰ کر کے وہ دنیا کو اس امر کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ حضور کے اخلاق کا جائزہ لیں... کیا محمد کی زندگی اور تعلیمات سے ایسے اصول سیکھے جاسکتے ہیں جو مستقبل کی دنیا کے لیے ایک واحد ضابطہ اخلاق کی بنیاد بن سکیں؟

دنیا نے ابھی اس سوال کا حتمی جواب فراہم نہیں کیا۔ مسلمانوں نے محمد کے متعلق اپنے دعوے کی تائید میں جو کچھ کہا ہے، وہ اس دعوے کے ابتدائی بیانات سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ کچھ عیسائی اس سے متاثر بھی ہوئے ہیں۔ دنیا محمد کے متعلق، اس دعوے کا کیا جواب دیتی ہے، اس کا انحصار کسی حد تک اس بات پر بھی ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کا اپنا عمل کیا ہے۔ یہ بات ابھی مسلمانوں کے ذمے ہے کہ وہ باقی دنیا کے سامنے اپنے دعوے کا بھرپور اور بہتر ثبوت پیش کریں۔ کیا مسلمان محمد کی زندگی کی طرف پھر رجوع کر سکیں گے اور اس میں سے عالمگیر اصولوں کو منگانی خصوصیات سے الگ کر کے ایسے اخلاقی اصولوں کا انکشاف کر سکیں گے جو دنیا کی موجودہ حالت کو بہتر بنانے کے لیے ان کی جانب سے ایک تعمیری کوشش ثابت ہو۔ یا اگر یہ امر، توقع سے کچھ زیادہ ہے تو کیا مسلمان، کم از کم، یہ ثابت کرنے کے قابل ہو سکیں گے کہ محمد کی زندگی متحدہ عالم کے اخلاق کے لیے مثالی انسان کی ایک قابل عمل مثال ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے کے قابل ہو سکیں تو کچھ عیسائی یقیناً ان کی بات سننے کو تیار ہو جائیں گے۔

میں اپنی ذاتی رائے کو چھپانا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں مسلمان دنیا کی رائے کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے، کم از کم اخلاق کے میدان میں۔ عیسائی یورپ کو اس امر کا قائل کرنے کے لیے کہ محمدؐ کی تقلید سے اخلاق کے مثالی نمونے پیدا ہو سکتے ہیں، مسلمانوں کو نا حال بہت کم، بلکہ کوئی کامیابی حاصل ہی نہیں ہوئی۔

(MOHAMMAD AT MEDINA, PAGE 333-334, 1962)

میرے بیٹے! یہ ہیں وہ تین زبردست چیلنج جو عیسائی دنیا نے مسلمانانِ عالم کو اس صدی میں دیے ہیں۔ ہماری قوم کے علمائے کرام اور صوفیانِ عظام چونکہ بالعموم انگریزوں کے لیے زندہ ان چیلنجوں کو پڑھتے ہیں اور نہ ان اعتراضات سے آگاہ ہو سکتے ہیں جو یورپ کا مذہبی طبقہ قرآن اور حاملِ قرآن پر دو سو سال سے کرتا چلا آرہا ہے۔ سچ کہا تھا کسی نے کہ ”لا علمی بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔“ اسی لیے ہمارے علماء اور صوفیاء کی راتیں کسی قسم کی کش مکش میں نہیں گزرتیں اور اسی لیے تو وہ بڑے اطمینان سے تعینین تعدادِ رکعاتِ تراویح، قرأتِ فاتحہ خلف الامام، تقبیل الاہبامین، رفعِ سبابة، آمین بالجہر، رفعِ یدین اور الزناق الکعبین بلکہ امکانِ کذبِ باری اور امتناعِ نظیرِ پیغمبر جیسے مضید اور ایمان افروز مسائل میں سہنک رہتے ہیں۔

رہے ہماری قوم کے انگریزی دان حضرات، تو وہ ان چیلنجوں سے تو آگاہی حاصل کر لیتے ہیں مگر چونکہ قرآن اور اس کی زبان دونوں سے نابلد ہیں (الآ ماشاء اللہ) اس لیے کسی چیلنج کو قبول نہیں کر سکتے۔ صرف چند لمحات کے لیے متأسف ہو کر پھر ”کار دیگر“ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ کلام ایک عربی دان اور انگریزی دان دونوں میں سے کوئی طبقہ کسی چیلنج کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

۱۔ اندریں حالات میں تمہیں ان تینوں چیلنجوں کو قبول کرنے کا مشورہ دینا ہوں اور اسی غرض سے یہ خامہ فرسائی کی ہے۔ تم نے بفضلِ خدا انگلستان سے فلسفے میں

لے واضح ہو کہ میں نے مثلاً یہ چند مسائل لا طائل درج کر دیے ہیں۔ اگر استقصاء کیا جائے تو کئی صفحات سیاہ ہو سکتے ہیں۔

ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے اور فلسفہ جدیدہ میں ڈاکٹریٹ کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

۲۔ تم ایک دیندار اور علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔

۳۔ تم نے دینی ماحول میں پرورش پائی ہے۔

۴۔ تمہارے اندر دین کی تبلیغ کا جذبہ بھی موجود ہے اور

۵۔ تم دین اسلام کو علی وجہ البصیرت بنی آدم کے لیے بہترین ضابطہ حیات

یقین کرتے ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہارے بڑے بھائی، اخویم امر راجہ

سکندر، اپنی زندگی اخلاعتِ قرآن کے لیے وقف کر کے تمہارے لیے

ایک اعتبار سے اسوۂ حسنہ بھی پیش کر دیا ہے۔

لہذا اب جس طرح تمہارے بڑے بھائی نے اپنی زندگی دعوت الی القرآن

کے لیے وقف کر دی ہے تم اپنی زندگی مغرب کو اسلام کی خوبیوں سے روشناس

کرانے کے لیے وقف کر دو تو تمہیں وہ کامیابی حاصل ہوگی جو تمہارے پیش رو

حضرات کو حاصل نہ ہو سکی۔ میں ان سب لوگوں کو جانتا ہوں جنہوں نے بیسویں

صدی میں اپنی زندگی تبلیغ کے لیے وقف کی۔ مگر ان میں سے کوئی شخص منطقی اور فلسفی

نہیں تھا، اور اس لیے وہ اسلام کو دیہات میں تو پیش کر سکے، آکسفورڈ یا کیمبرج

میں پیش نہ کر سکے۔

دیکھ لو! نیگوار اور رادھا کرشنن نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں ہندو دھرم کو

پیش کر کے غیروں کی نگاہ میں کتنی شہرت اور اپنوں کی نظر میں کتنی عزت حاصل کی

ہے۔ یہ میرے سامنے کی بات ہے۔ اگر مل سکے تو رادھا کرشنن کی

'AN DEALIST VIEW OF LIFE' ضرور پڑھ لینا۔ یہ

'LECTURES' ہیں اور ان میں اس نے ہندوؤں کے فلسفیانہ مذہب یعنی

'VEDANTIC IDEALISM' کی بڑی تمام مدارسِ فلسفہ پر ثبات کر کے اپنی

علیت اور ویدانت کی عظمت کا سکہ انگریزوں کے دل و دماغ پر جما دیا ہے۔

پروفیسر میکینزی، پروفیسر میور ہیڈ اور پروفیسر جود کا اعتراف تو میں خود پڑھ

چکا ہوں۔ (بقیہ ص ۵۹ پر)

کتابیات

سیرۃ الخلیل (باب دوم)

بیان و برہان کی خوش اسلوبی اور شہ زہی

مولانا الطاف الرحمن بنوی

جس طرح انسانوں کی رنگتیں اور حُلے ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہوتی ہیں اور باوجود اولین و آخرین کی اس کثرت کے وہ انسانوں کے رنگ و حُلے کی مکمل وحدت کی کوئی ایک مثال نہیں ملے گی۔ اسی طرح سے ان کی طبیعتیں اور ذہنیتیں بھی یکساں نہیں ہوتیں بلکہ فعل و انفعالی اور تاثیر و تاثر میں متفاوت ہوتی ہیں۔ افتاد و سرشت کا یہ فرق ان کی زندگی کے ہر گوشے میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور یہی وہ فطرۃ اللہ ہے جس کا ہر فرد بشر بلا کم و کاست غیر شہودی طور پر پابند ہوتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر عقل و فلسفہ کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ ہر بات کو اسی کی روشنی میں دیکھتے اور اسی کی میزان سے تولتے ہیں جب تک کسی مدعا کو عقلی دلائل کے حامل اور نتیجے کے طور پر پیش نہ کیا جائے کوئی اعجوبہ اور کرشمہ ان کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو استدلال کی پیچیدگیوں سے گھبراتے ہیں فکر و نظر کی معمول جھلیوں سے اکتا ہوتے ہیں وراثت نام کی کوئی چیز پہچانتے ہیں اور نہ ہی درایتی نقد و جرح کا عمل جانتے ہیں ان کے ہاں رد و قبول کا معیار نرا وجدان ہوتا ہے جو کبھی تو بڑی آسانی سے کسی سیدھی سادھی اور بالکل ہی مبتذل قسم کی بات سے یکایک متاثر ہو جاتا ہے اور کبھی مشکل ہی کسی غیر معمولی اور خرقہ عادت

ادا سے —

خدا نے قدوس کی رحیمی و کریمی اور شفقت و مہربانی انسانوں کی ہدایت کے لئے انہی کی جبلت اور صلاحیت کے مطابق انتظام کرتی ہے۔ تاکہ اگر کسی کے اندر توجہ و انابت کی ادنیٰ ترین رُمق بھی موجود ہو تو صواب و ثواب سے محروم نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی کو بالخصوص اس نوع کے دلائل و معجزات دیئے جاتے ہیں جو اہل زمانہ کی ذہنی سطح اور استعداد سے قریبی رشتہ رکھتے ہوں نیز انہماکِ کمال کے لئے وہی میدان منتخب کیا جاتا ہے جس سے انہماکِ قوم کے

زیادہ سے زیادہ دلچسپیاں وابستہ ہوں
تواریخ و آثار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرستی
کے ساتھ ساتھ ستارہ پرست بھی تھی۔ چنانچہ اسی تعلق سے نجوم و ہیت میں یدِ طولی رکھتی تھی۔ علامہ
عباس محمود عفا دمہری "الاولاد نبیاء" میں لکھتے ہیں۔

"تاریخی کھوج لگانے والوں نے بابل اور اشور کے آثارِ عتیقہ میں لوسہ کی تختیوں
پر ایسے بہت سے کلمات پائے ہیں جو قدیم علم الافلاک کی اصطلاحیں ہیں ان میں
منازل و بردج کے اسماء بھی شامل ہیں اور کواکب و نجوم کے مجموعے بھی۔"
سائنسی آلات اور دوربینیں تو اس وقت تھیں نہیں جن کی مدد سے افلاک و کواکب
کے علم و فہم کا تمام تر دار و مدار انبات — وجود معلول سے وجود علت معلوم کرانے کے طریقہ
استدلال — پر تھا، اس قسم کے نجوم و ہیت میں تحقیق و تفحص کی جن باریکیوں اور موٹگائیوں
سے سابقہ پڑتا ہے اور پھر ان بحثوں کے تداول اور جولانیوں سے انسانی ذہن کا جو سانچہ
تیار ہوتا ہے۔ اور اثر اندازی و اثر پذیری کی جس ڈگر کا خوگر بنتا ہے اس سے تو یہی اندازہ
ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی بڑی مناظرہ باز اور محبت طرانہ واقع ہوئی ہوگی
اور محاجاۃ ہی کو وہ بنیادی اور آخری معرکہ سمجھتی ہوگی جس کا سر کرنا ہی اہم مقصد کی طرف
رسانی کا موثر ذریعہ بنتا ہو۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام
کے سلسلہ ذکر میں اس کے مناظرات کو بڑی تفصیل اور اہتمام سے ذکر کیا ہے۔

لیکن اس تجزئے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر قوم
میں عوام کی تعداد و خواص سے زیادہ ہوتی ہے جہاں فردی حکومت کے اراکین و اساطین
اور بابل کی مذہبی نمائندگی کرنے والے پیشواؤں اور مقتداؤں کو فکر و دانش کی قوتوں
سے رام کیا جاسکتا تھا۔ دلائل عوامی اکثریت کے اطمینان و تسلی کے لئے بھی پیغمبر کی ذات
میں مناسب مواد ہونا ضروری تھا۔

لے مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ اپنی کتاب "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام عاملین" میں
انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے طریقہ تعلیم پر بحث کرتے ہوئے قرآنی دلائل کی نوعیت کے (باقی اگلے صفحہ پر)